© rasailojaraid.com

# مشرقِ وسطیٰ۔یورپی تناظر میں

مراد ولفرائڈ ہوف مین

## تاریخی تناظر

یورپ کے مشرقِ وسطیٰ کے ساتھ تعلقات تاریخ کا حصہ ہیں۔آخر ایسا کیوں نہ ہو کہ جس عیسائی مذہب کے ساتھ اہلِ یورپ کی وابستگی ہے اور جس نے ان کے ذہنوں کو مسخر اور زندگی کو اپنے حلقۂ اثر میں لے رکھا ہے، اس کا ظہور مشرقِ وسطیٰ میں ہی ہوا تھا۔عیسائیت کی حیثیت بھی ایک مذہبی فرقہ سے زیادہ نہ تھی جو افلاطونیت (Platonism)، مانویت (Manichaeism)، زرتشتی فکر (Zoroastrianism)، آفتاب پرستی (Mithraism)، یہودیت اور نوافلاطونیت (Neo-platonism) کی طرح مشرقی بحیرۂ روم سے یورپ میں در آیا تھا۔درحقیقت عیسائیت کے چند مخصوص اوصاف مثلاً تثلیث کا عقیدہ، پوپ کا منصب اور کرسمس کا مخصوص دن وغیرہ سب مشرقِ وسطیٰ کے مذاہب سے لیے گئے ہیں۔مثلاً قدیم روما کے ہاں متبرک ثلاثہ کا تصور، مذہبی رہنماؤں کے سربراہ پونٹی فیکس میکسی مس یا بڑے پادری کا عہدہ (جسے آج کل پوپ کہا جاتا ہے) اور روما کے ہاں جشنِ زحل جو دسمبر میں منایا جاتا تھا اور جسے آج کل کرسمس کہا جاتا ہے۔مختصراً یہ کہ عیسائیت نے مشرقِ وسطیٰ کے مذہبی ماحول میں ہی جڑیں پکڑیں اور فروغ حاصل کیا۔

یہ رائے قائم نہیں کی جاسکتی کہ اہلِ یورپ اس حقیقت کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔تاہم کیتھولک چرچ کی نسبت پروٹسٹنٹ چرچ کے یورپی عیسائیوں کو مسلسل یہ یاد دہانی کروائی جاتی ہے کہ ان کے مذہب کے بانی نے مشرقِ وسطیٰ کے ایک یہودی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی اور یہ کہ ان کی کتابِ مقدس 'بائبل' کے زیادہ تر

---

ڈاکٹر مراد ولفرائڈ ہوف مین سابق جرمن سفیر ہیں۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حصے کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں۔ بائبل کے عہد نامۂ قدیم اور زبور کے حمدیہ گیت ہی ہیں جو عیسائیوں کی عبادت کا حصہ ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بائبل کی یہودی، کیتھولک، آرتھوڈوکس اور پروٹسٹنٹ اشاعتوں کے متن میں فرق ہے۔ اس سب کے باوجود بائبل کی یہ اشاعتیں ایک ایسے مضبوط ذریعے کی شکل میں موجود ہیں جنھوں نے یورپی عیسائیوں کا تعلق اُس علاقے سے جوڑ رکھا ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور ان کے عقیدے کے مطابق مصلوب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی یورپ کے بہت سے مذہبی عقیدت مند یروشلم کے ساتھ جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔

قرونِ وسطیٰ میں یہ عقیدت اتنی غالب تھی کہ ہزاروں نوجوان حتیٰ کہ بچے بھی مقدس مقامات کو مسلمان حکمرانوں کے قبضے سے آزاد کروانے کے لیے نکل پڑے۔ وہ پُرعزم تھے کہ یہ مقدس لڑائی انہیں جیتنی ہے، چاہے اس کے لیے ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

۱۰۹۵ء سے ۱۲۹۱ء تک تقریباً دو صدیوں پر محیط اس دور میں پوپ اربن دوم کے تحریک اور ولولہ دلانے پر کم از کم ۹ صلیبی جنگیں ہوئیں، جن میں یورپ کے مشہور جانباز سردار (knights) حتیٰ کہ فرانس کے لوئس نہم (۵۴-۱۲۴۸، ۱۲۷۰) اور انگلینڈ کے رچرڈ شیر دل (۹۲-۱۱۸۹) جیسے بادشاہ مشرقِ وسطیٰ میں لڑی جانے والی ان جنگوں کے لیے یہاں پہنچے اور صلیبی ریاستوں کی بنیاد بھی رکھ دی۔ انہیں بالآخر صلاح الدین ایوبی نے ارضِ فلسطین سے نکال باہر کیا۔ (صلاح الدین ایوبی کی اس فتح کا اثر اس وقت زائل کیا جاسکا جب گزشتہ صدی میں استعماریت کے ہتھکنڈوں اور یہودی آبادکاری کے ذریعے اسرائیل کو یہاں قبضہ دلایا گیا۔)

مسلمان حکمرانوں کے لیے یہ صلیبی جنگیں ایک ضمنی تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں، جو کہ مسلمانوں کے دو اہم ہم عصر تہذیبی مراکز بغداد اور قرطبہ سے کوسوں میل دور لڑی جا رہی تھیں۔ لیکن یورپ پر ان جنگوں کے اثرات بڑے گہرے اور دوررَس ثابت ہوئے۔ ان پر نہ صرف خوف کی ایک کیفیت طاری رہی جو بالآخر ہنٹنگٹن کے اسلام سے خائف ہونے کا اظہار بنی، دوسری طرف انہوں نے اس سے اپنے لیے مثبت نتائج پیدا کرنے کی منصوبہ بندی بھی کی۔ مشرق میں کی جانے والی اس جنگی مہم جوئی نے یورپی ثقافت پر



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان گنت اثرات مرتب کیے۔ان اثرات نے یورپی ادب، ریاضی، ٹیکنالوجی اور ایجادات میں قوتِ محرکہ کا کام کیا اور شجاعت و بہادری کے نئے اُفق وا ہوئے۔حتیٰ کہ تجارتی میدانوں میں بھی دونوں اطراف کا نفع بڑا نمایاں تھا۔وینس نے مشرقی بحیرۂ روم کے سواحل پر واقع ممالک کے ساتھ تجارت میں بڑا فائدہ اُٹھایا۔

اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ جب چھٹی صلیبی جنگ اختتام پذیر ہوئی تو اہلِ یورپ نے مشرق کے پُرامن اور خیر سگالی دورے کرنا شروع کر دیے تھے۔صلیبی جنگی جہاز پر اسی طرح کا ایک دورہ اسیسی کے سینٹ فرانسس (۲۰-۱۲۱۹ء) اور پوپ کے دباؤ پر چھٹی صلیبی جنگ میں حصہ لینے والے جرمن بادشاہ فریڈرک دوم (۲۹-۱۲۲۸ء) نے مصر کا کیا۔اس دورے کو عالمگیریت کی پہلی مثال قرار دیا جاسکتا ہے، جب دو حریف ثقافتیں ایک دوسرے پر اپنے اثرات مرتب کرنے کی ابتداء کر رہی تھیں۔اس واقعے کے بعد مغرب کبھی بھی پہلے کی طرح مسلم تہذیب سے الگ تھلگ نہ رہا۔

اندلس اور سسلی میں مسلم ثقافت اسی طرح کے مضبوط اور پر تاثیر اثرات یورپ پر مرتب کر رہی تھی۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سپین آج کی تاریخ تک بھی عیسائیوں سے زیادہ طویل عرصہ مسلمانوں کے پاس رہا ہے، کیونکہ اندلس پر مسلمانوں کا دورِ حکومت ۷۳۶ برسوں پر مشتمل ہے۔یعنی بنواُمیہ کے ۷۵۶ء تا ۱۰۸۶ء، المرابطون کے ۱۰۸۶ء تا ۱۱۵۷ء، الموا‌حدون کے ۱۱۵۷ تا ۱۲۳۷ء اور قرطبہ پر بنونصر کے ۱۲۳۷ء تا ۱۴۹۲ء۔

مسلمانوں کے اس دورِ حکومت میں یورپ نے زیادہ تر طلیطلہ کے راستے سے مسلم آرٹس اور سائنس میں بہت کچھ سیکھا (سوائے مذہبیات کے)۔زراعت میں بادام اور زیتون کا پھل یہاں سے پہنچا، جبکہ ہوائی چکی کا تصور یورپ نے یہاں سے ہی لیا تھا۔علم الاعداد میں یورپ نے بے ڈھنگے رومن ہندسوں کی جگہ عربی اعداد کو اپنایا۔فلسفے اور علم الادویات میں تو کیا کہنا، کہ پُروقار اور شاندار طرزِ زندگی کا تصور ہی یہاں سے پہنچا۔

ابنِ سینا کی کتاب ''قانون'' یورپ میں اٹھارویں صدی عیسوی تک میڈیکل ٹیکسٹ بک کے طور پر پڑھائی جاتی رہی۔ابن رشد نے ارسطو کی فلسفے پر لکھی گئی کتاب کی جو تشریح کی تھی اس نے پیرس کی یونیورسٹی میں ہلچل مچائے رکھی۔اسی کی مدد سے سینٹ تھامس اقیناس نے متکلمانہ تعلیم (Scholesticism) کا



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طریقۂ تدریس متعارف کروایا تھا۔

مشرقِ وسطیٰ کا مذہب 'اسلام' ایک دفعہ پھر اٹھارویں صدی عیسوی میں اُس وقت یورپ پر اثر انداز ہوتا ہوا نظر آیا جب خدایا ہستیِ برتر کے وجود کے اقرار کے ساتھ فطرت و استدلال کی بصیرت پر عقیدے کی بنیاد رکھنے والے یورپی مفکرین نے اس نظریے (Deist) کا پرچار کیا کہ خالقِ کائنات تو ہے لیکن کاروبارِ کائنات میں حصہ نہیں لیتا۔ روشن خیالی کے اس فلسفے کی نمایاں نمائندگی کرنے والے مفکرین میں امانوئیل کانت (۱۷۲۴ء-۱۸۰۴ء)، والٹیئر (۱۶۹۴ء-۱۷۷۸ء)، بروشیا کے فریڈرک دوم (۱۷۱۲-۱۷۸۶ء)، جوحان والف گینگ وان گوئٹے (۱۷۴۹ء-۱۸۳۲ء) اور گوتھ ہولڈ افرائم لیسنگ (۱۷۲۹-۱۷۸۱ء) شامل تھے۔ ان سب نے کیتھولک یا پروٹسٹنٹ ہر دو چرچوں کے اختیارات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ انہوں نے متعصب پادریوں کو ایک ایسے فرقے کے طور پر مثال بنا کر پیش کیا جو جہالت اور بے علمی کے گڑھے میں گرے ہوئے تھے۔ یہ تمام مفکرین اسلام سے متاثر تھے، خصوصاً اس کے بے لاگ عقیدۂ توحید، تثلیث اور اوتار کے عقیدے کا مکمل رد، اہل کلیسا کے حق استثناء سے انکار نیز بپتسمہ، ناکتخدائی اور تجرد کی زندگی جیسے عوامل سے مکمل انکار اور عقل پر مبنی قرآنی رویہ کے اوصاف سے بے انتہا متاثر تھے۔

نپولین کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں میں گوئٹے نے وائیمر کے مقام پر زار کے مسلمان سپاہیوں کو نماز ادا کرتے دیکھا تھا۔ اس نے ۱۷۷۲ء میں ڈیوڈ فریڈرک میگرلین کے جرمن زبان میں قرآن کے ترجمے کو بھی پڑھا تھا۔ یہ ترجمہ انتہائی ابتدائی تراجمِ قرآن میں سے تھا اور اسے ''ترک بائبل'' کا نام دیا گیا تھا۔ گوئٹے نے ۱۴ ویں اور ۱۵ ویں صدی کے ایرانی صوفی شاعر حافظ شیرازی کی شاعری سے متاثر ہو کر مذہبی شاعری بھی کی تھی۔

دوسری طرف جرمنی کے مشہور ڈرامہ نگار گوتھ ہولڈ لیسنگ نے اپنے ڈرامے Nathan and Wise میں مسلمان کرداروں کو مثبت شکل میں پیش کر کے سب کو ششدر کر دیا تھا۔ اسے اس بات سے تو کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ مسلمان ہو جائے لیکن وہ اپنے دور میں زوال پذیر ہوتی عیسائیت کے خلاف اسلام کی کسی بھی اثر پذیری کو روکے رکھنا چاہتا تھا۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے بعد ۱۹ویں صدی میں یورپ ملحدانہ طرزِ فکر کی طرف مائل رہا۔ جن مفکرین نے اس سوچ کو ہوا دی، ان میں لُڈوِگ، فیور بیگ، کارل مارکس، چارلس ڈارون اور فریڈرک نطشے شامل ہیں۔ اس صدی میں یورپ نے اپنی استعماری پالیسی کے باعث مشرقِ وسطیٰ کو ایک شکار گاہ بنائے رکھا۔ اس خطے میں موجود استعماری طاقتوں برطانیہ اور فرانس نے لیگ آف نیشنز سے توثیق کروا کر علاقے کو اپنے درمیان تقسیم کرلیا اور اس کا معاشی استحصال شروع کردیا۔

اہلِ یورپ نے استشراقی مطالعے میں اپنی نسلی برتری کو بڑا نمایاں کر کے پیش کیا۔ وہ عربوں کے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ کرتے ہوئے انہیں اپنے قبضے کے خیر خواہانہ پہلو سمجھا رہے تھے کہ اس میں مقامی لوگوں کے فائدے ہی فائدے ہیں۔

اس سارے عمل میں یورپ کے سیاستدانوں، سائنسدانوں، تاجروں، فوجیوں اور مشنری مبلغوں نے مشرق وسطیٰ کے بارے میں بہت کچھ جانا۔ لیکن۔ بہت کم سمجھا۔ وہ خود مادہ پرست اور لاادری (خدا کے بارے میں تشکیک میں مبتلا) تھے، اس لیے اس خطے میں نہ تو مذہب کی اہمیت کا ادراک کرسکے اور نہ انہیں یہ سمجھ آسکا کہ اسلام کا سماجی کردار یہاں پر کتنا مضبوط ہے۔ لاعلمی کی اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ایک بالکل غلط اور غیر منصفانہ اندازِ فکر کو اپنا لیا اور ان کے نزدیک مسئلہ فلسطین کا آسان حل یہ تجویز ہوگیا کہ خطے کو ''زمین کے بغیر لوگوں'' کی خاطر ''لوگوں کے بغیر زمین'' بنا دیا جائے۔

جب فلسطینیوں نے صیہونی قبضے کے خلاف مزاحمت شروع کی اور بڑی تعداد میں پناہ گزیں یورپی ممالک میں جا پہنچے تو مشرقِ وسطیٰ سے متعلق یورپ کے نقطۂ نظر میں پھر سے تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ اب یورپی ممالک اس خطے کے معاملات میں گھرتے چلے جا رہے تھے اور دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دینا ان کی مجبوری بنتی جا رہی تھی۔ اس کے نتیجے میں حکومتوں کو اپنی آبادی میں پھوٹ، اختلاف اور مناقشت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

یورپی ممالک کی حکومتیں عمومی طور پر اور جرمن حکومت بالخصوص اپنے تاریخی پس منظر کے باعث اسرائیل کی حمایت پر گامزن رہتی ہیں جبکہ عوام صیہونی سفاکی کا بچشم خود مشاہدہ کرنے اور علم اور سوچ کے لحاظ سے بالغ



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظر ہو جانے کے باعث مظلوم فلسطینیوں کی طرف داری کر رہے ہوتے ہیں۔

اس پس منظر کو سامنے رکھا جائے تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ یورپ کا رویہ امریکی رویے کے خلاف ہے جس میں اسرائیل کی حمایت کبھی بھی سوالیہ نشان نہیں رہی۔ اسرائیل برا کرے یا بھلا، امریکہ کی بلا سے۔ اس کا بھائی چارہ اسرائیل کے ساتھ ہی ہے۔ اس رویے نے امریکہ کو سیاسی، فوجی اور معاشی میدان میں اسرائیل کا غیر مشروط حلیف بنا دیا ہے۔ اس اندھی حمایت کے پیچھے طاقت ور یہودی لابی اور اس کی میڈیا میں موجودگی کے ساتھ ساتھ انتہا پسندانہ نظریات رکھنے والے ان پروٹسٹنٹ عیسائیوں کا بھی بہت اہم کردار ہے جو امریکہ میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اُن کے نزدیک وہ جو کچھ بائبل میں پڑھتے ہیں سب واہیات ہے۔ ہاں انہیں یہ یقین ہے کہ یسوع مسیح کی دوبارہ آمد کا مکمل طور پر انحصار اس بات پر ہے کہ (غیر عیسائی) اسرائیلی فلسطین میں پہلے کی طرح دوبارہ سے مضبوط ہو جائیں۔

یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اہل یورپ اور امریکی ۱۱ ستمبر کے حملوں کی مختلف انداز سے توضیح کرتے نظر آتے ہیں۔ امریکیوں نے اس واقعہ کا کوئی بھی تجزیہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے اس پر صرف اور صرف برائی کا ٹھپہ لگا دیا۔ انہوں نے کسی بھی جواب کا انتظار کیے بغیر بس ایک ہی دہائی ڈالے رکھی کہ "یہ لوگ (مسلمان) ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

اس کے برعکس یورپ کے لوگ باوجودیکہ ۱۱ ستمبر کو ہونے والے نقصان پر امریکہ کے ساتھ دکھ کا اظہار کر رہے تھے، لیکن انہوں نے فوری طور پر یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ امریکہ کو اپنے ساحلوں سے دور مشرق وسطیٰ میں کسی دوسرے کی جنگ میں متحرک فریق کا کردار ادا کرنے کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا ہے۔

امریکہ کے فوجی نقطۂ نظر کے برعکس مشرقِ وسطیٰ سے متعلق یورپ کی سوچ سیاسی، یہودی مداخلت سے کافی حد تک پاک اور علاقے سے متعلق بہت بہتر اور مؤثر معلومات پر مبنی ہوتی ہے۔ دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ یورپ میں رہنے والے فلسطینی اپنے مؤقف کو اُجاگر کرنے میں اس لیاقت اور قابلیت کا مظاہرہ نہیں کر پائے جس طرح امریکہ میں انہوں نے کیا ہے۔ یہاں پر شائد ہی کوئی ایسا کالج یا گریجویٹ سکول ہو جہاں فلسطینی پروفیسر موجود نہ ہوں اور فلسطینی طلبہ مسلمان طلبہ کی تنظیموں کے پلیٹ فارم سے فعال کردار ادا



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ کر رہے ہوں۔ جس طرح یہودیوں نے ستم رسیدہ بن کر پوری دنیا میں بکھر جانے کے بعد تعلیم کے میدان میں غیر معمولی قابلیت حاصل کر لی تھی، اسی طرح اب اسرائیل کے ہاتھوں ستم رسیدگی کا شکار ہو کر فلسطینی بھی دنیا بھر میں جرأت اور دلیری کے ساتھ ساتھ تعلیم میں بھی اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔

یورپ کے اندر بڑی تعداد میں آ کر بس جانے والے مسلمان مہمان کارکن (guest workers) مہاجر فلسطینیوں کے لیے ایک اثاثہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر البانیہ، الجیریا، افغانستان، بوسنیا، مصر، بھارت، ایران، عراق، کوسووو، مراکش، نائجیریا، پاکستان، سینیگال، صومالیہ اور تیونس سے آئے ہوئے ہیں۔ انسانی فطرت کے عین مطابق یہ تمام لوگ سب سے پہلے اپنے ملک کے بارے میں ہی سوچتے ہیں اور ہر کوئی اپنے کسی نہ کسی مسئلے میں اُلجھا ہوا محنت مزدوری کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یورپ میں رہنے والے ان تمام مسلمانوں کو فلسطین میں ہونے والے واقعات بڑی شدت کے ساتھ متأثر کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مسلم اُمہ کا تصور ابھی بھی ایک حقیقت رکھتا ہے اور اس بات کی نشاندہی بھی کرتا ہے کہ ارضِ فلسطین کے مقدر کا فیصلہ فلسطینیوں کے حق میں بہت پہلے سے ہو چکا ہے۔

## موجودہ دور میں تنازعہ فلسطین میں یورپ کا کردار

اکثر یورپی ممالک اب یورپی یونین کے ممبر ہیں۔ تاہم یورپی یونین بہترین نتائج تبھی حاصل کر سکتی ہے اگر مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے ساتھ اقتصادی تعلقات کو نئی نہج دی جائے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو یورپی یونین کو اس خطے میں امریکہ، روس اور چین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ خارجہ پالیسی کے سیاسی، فوجی اور ثقافتی پہلو دو ممالک کے باہمی تعلقات پر ہی مبنی ہوتے ہیں۔ انہیں صرف یورپی ممالک کے نقطۂ نظر سے قابلِ عمل اور درست نہیں سمجھا جا سکتا۔

## عراق

کویت پر صدام حسین کی جارحیت کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے جو اتحاد تشکیل دیا گیا تھا، وہ یورپی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ممالک اور امریکہ کے درمیان فوجی تعاون کا سبب بنا اور اس طرح دونوں فریق ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ یہ تعاون ۱۱ ستمبر کے واقعہ اور طالبان کے خلاف اعلانِ جنگ کے بعد اتحاد کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ البتہ یہی تعلق اور تعاون وہ وجہ بنا جس کے سبب امریکہ کے عراق پر حملہ آور ہونے کے عزائم اس کی اصل منصوبہ بندی کے ساتھ پورے نہ ہو سکے۔ امریکہ سے اختلاف کرتے ہوئے فرانس اور جرمنی جیسی دو انتہائی اہم اور با اثر یورپی ریاستیں نہ صرف اس اتحاد سے باہر نکل آئیں بلکہ امریکی حملے کی پوری شدت کے ساتھ مخالفت بھی کی۔ اٹلی، اسپین اور چند ایک وسطی اور مشرقی یورپ کی ریاستیں جنہوں نے امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ مل کر عراق کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا اور وہ جنہوں نے ان کی مخالفت کی تھی، باہمی اختلافات کے باعث تقسیم ہوتی رہیں۔ تاہم جب بش نے عراق میں ''مشن کی تکمیل'' کا اعلان کیا تو یورپی یونین نے جنگ کے دوران ہچکچاہٹ کا رویہ اپنائے رکھنے کے باوجود اب بہتر جانا کہ سقوطِ بغداد سے ملنے والے مفادات حاصل کرنے کے لیے پالیسی تشکیل دی جائے۔

اب جبکہ عراق خانہ جنگی کے اثرات سے باہر نکل رہا ہے تو یورپی رہنما اس تحریص میں مبتلا ہیں کہ یہاں موجود انسانی وسائل کی ترقی، تعمیرات، سیکیورٹی کے اُمور میں معاونت اور توانائی کے شعبوں میں موجود مواقع سے کیسے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اسی ضمن میں ۲۰۰۹ء کے اوائل میں فرانس کے صدر نکولس سرکوزی، جرمنی کے وزیر خارجہ فرانک والٹر سٹینمیئر اور برطانیہ کے وزیر تجارت پیٹر مینڈلسن نے بغداد جانے والے تجارتی وفود کی قیادت کی۔

یورپی یونین کے نائب صدر کا یہ بیان اسی سمت میں ایک اشارہ ہے۔

''یورپی یونین ۲۰۰۳ء کے بعد عراق کے لیے دی گئی امداد میں ایک بلین یورو سے زائد رقم فراہم کر چکا ہے۔ یہ امداد بنیادی خدمات، انسانی وسائل کی ترقی، مہاجرین، اچھے نظام حکومت، سیاسی عمل اور استعداد کاری جیسے عوامل پر خرچ کی گئی ہے جن کی درجہ بدرجہ فوقیت کا تعین خود عراقی حکومت نے کیا تھا۔'' ۱

عراق کو جنوب کی جانب راہداری کی اہمیت حاصل ہونے کے سبب ان علاقوں تک قدرتی گیس کی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فراہمی کا منصوبہ قابلِ عمل بنایا جاسکتا ہے۔ یورپی یونین نے ''توانائی کی تزویراتی شراکت داری'' (Strategic Energy Partnership) پر عراق کے ساتھ مفاہمتی یادداشت پر دستخط کررکھے ہیں جس کے ذریعے یورپی یونین عراق کے ساتھ توانائی کے منصوبوں کومزید تقویت دینے کا بنیادی ڈھانچہ ترتیب دے سکے گا۔ مفاہمت کی اس یادداشت میں تعاون کے لیے جومیدان چنا گیا ہے وہ مستقبل میں عراق کے اندر یورپی یونین کے کردار کا تعین کرتا نظرآتا ہے۔ یہ تعاون درج ذیل پہلوؤں پر محیط ہوگا۔عراق کے لیے توانائی کی پالیسی پر ترقیاتی کام، یورپی یونین اور عراق کے درمیان تعاون کے لیے توانائی کے ذرائع پر عملدرآمد کا پروگرام، عراق کی گیس کے ترقیاتی پروگرام کو جدید بنانے کا منصوبہ، عراق کے ہائیڈروکاربن وسائل کی نقل وحرکت اور فراہمی کے نیٹ ورک کا تخمینہ لگانا، پائپ لائنوں کی پائیداری اور حفاظت کا معیار مزید بہتر بنانا، گیس کی عراق سے یورپی یونین تک فراہمی کے لیے درکار ذرائع اور روٹ کی نشاندہی کرنا، عراق میں توانائی کی پالیسی کی پائیداری کو یقینی بنانے کے لیے قانونی، اصولی اور ادارتی فریم ورک جیسے ضروری عوامل پر کام کرنا اور عراق میں توانائی کے تجدید طلب پہلوؤں کی ترقی کے لیے لائحہ عمل تیار کرنا۔ یورپی یونین عراق کے ساتھ شراکت داری اور تعاون کے معاہدے کو آخری شکل دے رہا ہے جو توانائی کی فراہمی کے خصوصی پہلوؤں پر مشتمل ہے۔

فوجی محاذ پر نیٹو کے ذریعے چلایا جانے والا تربیتی مشن ۲۰۰۳ء سے کام کررہا ہے۔ یہ مشن نہ صرف سینئر عراقی افسروں کو تعلیم فراہم کررہا ہے بلکہ پولیس کی تربیت بھی کررہا ہے۔ اگرچہ اسی مشن کے ذریعے تربیتی عمل بڑے پیمانے پر نہیں کیا جارہا، تاہم کچھ یورپی ممالک کے طرف سے عراق میں لڑی جانے والی جنگ میں ہچکچاہٹ کو مدّنظر رکھے جانے کے باعث یہ کافی حد تک مؤثر ہے۔

یورپی یونین کی عراق میں بڑھتی ہوئی مصروفیات بالخصوص توانائی کی پالیسیوں، توانائی کے ذرائع کی سیکیورٹی، تیل کی پیداوار میں بڑھوتری اور عراقی تیل کو یورپ تک پہنچانے کے لیے نئے راستے متعین کرنے کے اقدامات سے نہ صرف علاقے میں یورپی مفادات کو جلا ملے گی بلکہ دیگر مؤثر اور طاقتور ممالک بالخصوص امریکہ، برطانیہ، روس اور چین کے مفادات کا چیلنج بھی درپیش ہوگا۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

## ایران

۱۹۷۹ء کے انقلابِ ایران سے قبل یورپی ممالک دوطرفہ بنیاد پر ایران کے ساتھ سیاسی، سفارتی اور اقتصادی تعلقات کے مزے لے رہے تھے۔ تب بھی ان کے تعلقات کا مرکزی نکتہ تیل اور گیس ہی تھا۔ ایرانی انقلاب کے مابعد اثرات اور ایران کے 'نہ مشرق نہ مغرب' کے مؤقف کے باعث یہ متوازن تعلقات اختلافِ رائے، فقرے بازی اور سیاسی خلفشار کے ہنگاموں میں گم ہوگئے۔ تاہم اس کے بعد عراق کی کویت پر جارحیت اور ایران کے حریف ملک کے خلاف مغربی ممالک کے اتحاد نے تناؤ میں کچھ کمی کردی۔ چنانچہ ۱۹۹۰ء اور ۲۰۰۰ء کے ابتدا میں ان کے تعلقات میں کچھ بہتری نظر آئی۔ اس دوران دونوں طرف کی قیادت نے تعاون کو مزید پھیلانے کے لیے باہمی دلچسپی کے اُمور پر سنجیدہ گفتگو کا آغاز کیا۔ پھر ۲۰۰۱ء میں یورپی مشن نے بھی اپنے رابطے بحال کیے تاکہ ایران کے ساتھ قریبی تعلقات کو پروان چڑھانے کے لیے حالات و واقعات کے تناظر میں منصوبہ بندی کا آغاز کیا جاسکے۔ ایک مقصد تو یہ تھا کہ ''تجارت و تعاون کا معاہدہ'' (Trade and Cooperation Agreement) یعنی TCA حتمی طور پر طے کیا جاسکے، اس کے لیے مذاکرات کا آغاز دسمبر ۲۰۰۲ء میں ہوا۔ اگرچہ تجارت گہرے اور قریبی تعلقات کی راہ ہموار کرسکتی تھی لیکن ایک بار پھر سیاسی خوف و ہراس اور وسوسوں نے بہتری کی جانب بڑھتے اقدامات کا راستہ روک دیا، اس دفعہ اس کا سبب امریکہ کا ایران پر یہ دباؤ تھا کہ وہ اپنے ایٹمی منصوبے پر کام روک دے۔

یورپی یونین کو امریکہ اور برطانیہ کی قیادت میں لڑی جانے والی عراق جنگ میں امریکہ کے ساتھ جذباتی دباؤ پر مبنی تعلقات اور پھر تفرقہ اور پھوٹ کا تجربہ ہو چکا تھا، اس لیے اس نے ایران کے مسئلے میں خارجہ تعلقات میں مضبوط کردار ادا کرسکنے کی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے اپنے آپ کو جذبات کی رو میں بہنے نہیں دیا۔ چنانچہ برطانیہ، جرمنی اور فرانس آگے آئے اور اختلافات کے باعث راستے جدا ہوجانے کے سابقہ تجربے کی بناء پر اس معاملے کو فاتر العقل بش انتظامیہ کی طرح محض طاقت کی زبان کی بجائے زیادہ واضح ایجنڈے کے ساتھ حل کرنے کے لیے مذاکرات اور پُرامن طریقے اختیار کرنے کو ترجیح دی۔ اس سب کے باوجود یورپ کے ممالک کو نہ تو انفرادی ملک کی حیثیت سے اور نہ ہی یورپی یونین کے پلیٹ فارم سے ایٹمی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایران قابل قبول ہوسکتا ہے۔اس لیے ایک زیادہ معقول اور عملی قدم اُٹھایا گیا اور انٹرنیشنل اٹامک انرجی کمیشن کو یہ معاملہ ہاتھ میں لے کر اپنا کردار ادا کرنے کو کہا گیا۔باقی کی کہانی مذاکرات اور پابندیوں اور پھر مذاکرات کی ہے۔ضروری نہیں کہ ترتیب یہ ہی رہی ہو لیکن اہم بات یہ نوٹ کرنے کی ہے کہ ایران کے ایٹمی پروگرام کے معاملے میں یورپی ممالک کی اجتماعی سوچ تادیر امریکی دباؤ اور اس کے ایجنڈے کی یرغمال بنی رہی۔

موجودہ حالات میں جبکہ امریکہ ایک دفعہ پھر سلامتی کونسل کے ارکان اور اپنے یورپی اتحادیوں کو بہلا پھسلا کر ایران کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کر رہا ہے تو یورپی یونین حتیٰ کہ اس کے ممبر ممالک کے لیے انفرادی طور پر بھی یہ مشکل ہوتا جارہا ہے کہ وہ ایران کی انقلابی حکومت کے ساتھ تعلقات کو بہتر بناسکیں ایسے میں یورپی یونین کو انتہائی معقول طریقۂ کار یہ اختیار کرنا چاہیے کہ وہ ایران میں اپنے نفع اور نقصان کو سامنے رکھ کر پیش قدمی کے ذریعے صورتِ حال پر قابو پانے والا ایجنڈا بنائے ، ساری صورتِ حال کو عقلمندی کے ساتھ جانچے ،محتاط رویہ اختیار کرتے ہوئے اپنے مفادات کو مدّنظر رکھے اور اُن انٹیلی جنس ایجنسیوں کی بنائی ہوئی رپورٹوں کی طرف توجہ نہ دے جنہوں نے صدام حسین کے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں (Weapons of Mass Destruction) کے ذخیروں کا ثبوت پیش کیا تھا۔لیکن اس سب کے لیے یورپی ممالک کو امریکی مقاصد پر مبنی پالیسی کے سحر سے باہر نکلنا ہوگا اور ایک متبادل اور کھری قیادت فراہم کرنا ہوگی۔

## اسرائیل۔فلسطین تنازعہ

اسرائیلی فلسطین میں بڑے پیمانے پر اپنی آبادکاری کا جواز فراہم کرنے کے لیے اسے ''واپسی کا حق'' جتاتے ہیں (دوسری طرف وہ بے دخل فلسطینیوں کے لیے اسی حق سے انکاری ہیں)۔مسئلہ یہ ہے کہ یورپ کے نقطۂ نظر سے قوانینِ بین الممالک میں اس طرح کے دعویٰ کو تسلیم ہی نہیں کیا جاسکتا اور اس کی بڑی اچھی دلیل یہ ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں شاید ہی کوئی قوم اس جگہ آباد ہو جہاں اس کے آباء واجداد بستے تھے۔

اگر مخصوص آبادیوں یا لوگوں کو یہ حق حاصل ہوجائے تو اینگلو سیکسن جو کہ آج کے ڈنمارک سے آئے تھے ، انہیں برطانیہ خالی کردینا چاہیے۔امریکہ کے آئرستانی باشندے بخوشی اپنے گرین آئس لینڈ پر واپس



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چلے جائیں۔ تمام لاطینی امریکہ کو ریڈ انڈین قبائل کی طرف پلٹ جانا چاہیے۔ اسی طرح آسٹریلیا سے بھی بڑے پیمانے پر اخراج ہوگا۔ جرمنوں سے بھی یہ توقع رکھی جائے کہ وہ ذرا مزید مغرب کی طرف چلے جائیں تا کہ ان کی جگہ ان کے سلاوی (slav) پڑوسی پھر سے آباد ہوسکیں۔ سپین میں بھی اسی طرح کی ہلچل مچے گی اور فرانس بھی کیلٹی (Celtic) آبادی کو اس کا حقیقی وارث ہونے کے سبب واپس کرنا ہوگا۔ اس سلسلے کو برقرار رکھا جائے تو شمالی افریقہ کو بھی آبادی سے صاف کرنا ہوگا تا کہ قبل از تاریخ کے بربر قبائل کا حق انہیں لوٹایا جاسکے۔

یہ بات تو کھل کر سامنے آگئی کہ اہلِ یورپ کے ہاں اس طرح کے ''واپسی کے حق'' کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان لوگوں کے لیے تو بالکل بھی نہیں جو علاقے کو تقریباً ۲۰۰۰ سال قبل ۷۰ عیسوی میں اس کے تباہی سے دوچار ہونے کے بعد دوبارہ آبادکاری کے باوجود رضاکارانہ یا مجبوری میں چھوڑ چکے ہوں۔ مزید واضح بات یہ ہے کہ ان فلسطینی مسلمانوں کو تو ان کے خطے سے نکال باہر کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں جو حضرت عمرؓ کے عہدِ حکومت میں (۶۳۸ء) تقریباً ۱۳۷۱ سال قبل اپنے ملک کو اسلامی رنگ دے چکے تھے۔

۱۸۹۷ء میں باسل کے مقام پر تھیوڈور ہرزل کی قیادت میں ابتدائی صیہونیوں نے وقت اور حالات کے ساتھ تبدیل ہوتی ہوئی صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے پہلی ورلڈ کانگریس کا انعقاد کیا تھا۔ انہوں نے اس کانگریس میں ایک الگ ملک تلاش کرنے کا فیصلہ کیا جس کے لیے اُس وقت صرف فلسطین کے علاقے کو ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ گویا یہ اُس وقت کی بات ہے جب اُن کے پیشرووں نے یہ سنگدلانہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ فلسطین کو 'زمین کے بغیر لوگوں' کی خاطر 'لوگوں کے بغیر زمین' بنا دیا جائے کیونکہ انہیں اس زمین سے غرض تھی نہ کہ یہاں کے باسیوں سے۔

اسرائیل کے حمایتی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہودیوں کو فلسطین کے کم سے کم ایک حصے کا مالک بنانے کا منصوبہ ۱۹۱۷ء میں بدنامِ زمانہ ''بالفور اعلامیہ'' (Balfour Declaration) کے ذریعے انگریزوں نے دیا تھا۔ بہرحال اس اعلامیے نے ایک یہودی ریاست کو ارضِ فلسطین پر بنانے کی نشاندہی کر دی تھی۔ تاہم اُس وقت یہ کہا گیا تھا کہ ایسا کرتے ہوئے فلسطینی مسلمانوں اور عیسائیوں کے حقوق کا خیال رکھا جائے گا۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تب بھی یہودیوں کا ریاستی حیثیت منوانے کا دعویٰ مکمل طور پر گمراہ کن ہے کیونکہ ملکی اور بین الاقوامی قوانین کی رُو سے ایک بالکل واضح اُصول طے شدہ ہے کہ

''کوئی فرد ایسے حقوق کسی کو منتقل نہیں کرسکتا جن کا اختیار سرے سے اس کے پاس ہے ہی نہیں۔''

برطانیہ فلسطین کا حقیقی مالک نہیں تھا۔ برطانیہ کو یہ علاقہ عارضی طور پر لیگ آف نیشنز کے تفویض کردہ اختیار کے تحت حوالے کیا گیا تھا تاکہ مستقبل میں کسی موقع پر آزادی دینے تک اس کا نظم ونسق بہتر طور پر چلایا جاسکے۔ چنانچہ برطانیہ نے ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کے روز فلسطین کو صیہونیوں کے حوالے کرکے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا تھا۔ اس لیے اختیارات کے ناجائز استعمال کے باعث یہ اقدام کالعدم اور منسوخ سمجھا جانا چاہیے۔

برطانیہ یورپ نہیں البتہ یہ یورپ میں ضرور واقع ہے۔ میں ایک یورپی ہونے کے ناطے شرمندگی محسوس کرتا ہوں کہ برطانیہ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۸ء تک کیوں تذبذب میں رہا اور کوئی بات طے نہ کرپایا اور پھر فلسطین کے معاملے میں متولی ہونے کی ذمہ داری ایسے بھونڈے پن سے نبھائی کہ اب یہ کبھی ختم نہ ہونے والا تنازعہ بن گیا ہے۔

اہلِ یورپ کے لیے ابھی مزید شرمندگی ہی شرمندگی فلسطین میں ہونے والے حالات و واقعات میں یورپ کے کردار پر ہے جس میں اگر فلسطینیوں کی مدد نہیں بھی کی جارہی تو سب کچھ ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا جارہا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ یورپ اپنی محافظ عالمی طاقت اور اس وقت عملاً صیہونیت کے گھر امریکہ کے احترام میں سرتسلیم خم کیے ہوئے ہے۔ ان اندوہناک واقعات میں چند مشہور اور فیصلہ کن مرحلے درجہ ذیل ہیں۔

- **۶ تا ۱۰ جون ۱۹۶۷ء:** اسرائیلی فوج نے غزہ، القدس کے مشرقی حصے، شرق الاردن، سینائی اور گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کرلیا۔ یہ دن فلسطینیوں کے ہاں یوم النکبہ ٹھہرا جب ان پر بے پناہ تکلیفوں کا آغاز ہوا اور پھر اس کے بعد کی کہانی استعماریت کے ہتھکنڈوں، نسلی امتیاز، نسل پرستی اور فلسطینیوں کی مظلومیت سے عبارت ہے۔
- **۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء:** اقوامِ متحدہ نے سلامتی کونسل کی قرارداد ۲۴۲ کے ذریعے مطالبہ کیا کہ



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسرائیل نے اس وقت تک فلسطینیوں کی جتنی سرزمین پر قبضہ کیا ہے، وہاں سے فوجیں واپس بلالے۔ اس نے مہاجرین کے مسئلے کا منصفانہ حل تلاش کرنے کا بھی مطالبہ کیا (قرارداد ۲۴۲ کو اقوامِ متحدہ کی تمام قراردادوں سے زیادہ شہرت ملی، کیونکہ اس پر کبھی عملدرآمد نہیں کروایا جاسکا)۔

- ۱۷ ستمبر ۱۹۷۸ء: کیمپ ڈیوڈ سمجھوتہ طے پا گیا (لیکن اس پر کبھی بھی عملدرآمد نہ ہوسکا)۔ سمجھوتے کے بعد ۱۹ نومبر کو صدر انور سادات اسرائیلی پارلیمانی کنیسٹ میں گئے۔

- ۱۹۸۷ء: پہلی انتفاضہ کا آغاز ہوا۔ ۱۹۸۹ء تک ۶۰۰ فلسطینیوں (اور ۲۱ اسرائیلیوں) کو قتل کیا جاچکا تھا۔

- ۱۹۸۸ء: امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ جارج شُلز نے فلسطینیوں کے حقِ خود ارادیت کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا۔ القدس کو بین الاقوامی شہر کا درجہ دے کر دو ریاستیں تشکیل دینے کا حل ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ پہلے بھی تجویز کر چکی تھی۔

- ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ء: اوسلو معاہدہ پر یاسر عرفات اور اسحاق رابن نے دستخط کیے (جو اس کے قتل کا سبب بن گیا)۔

- اوسلو معاہدے کے تحت امن کوششوں کی ناکامی اور ایریل شیرون کے اشتعال انگیز مارچ کے باعث دوسری الاقصیٰ انتفاضہ کی ابتداء ہوئی۔

- ۲۸ مارچ ۲۰۰۲ء: سعودی بادشاہ عبداللہ نے تنازعہ کے حل کے لیے یہ تجاویز دیں۔

  (i) اسرائیل ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس چلا جائے۔

  (ii) فلسطینی مہاجرین کے مسائل کو اقوامِ متحدہ کی قرارداد ۱۹۴ کے مطابق حل کیا جائے۔

  (iii) آزاد فلسطینی ریاست قائم کی جائے، جس کا دارالحکومت مشرقی یروشلم ہو۔

اس توقع کا اظہار کیا گیا کہ ان سب تجاویز کی توثیق اسرائیل اور عرب دنیا کے درمیان ایک کثیر الفریق امن معاہدے کی صورت میں کی جائے گی۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان تمام باتوں میں دو پہلو بہت نمایاں ہیں۔ پہلا یہ کہ اوپر بیان کردہ اوران کے علاوہ دیگر تمام ابتدائی اقدامات میں سے کوئی ایک بھی نتیجہ خیز نہیں ہوا۔ تاہم جو کچھ اس کا متضاد ہوسکتا تھا وہ نتائج کی شکل میں سامنے آتا رہا۔ مثلاً جب سفارتکار مسئلے کے حل کی کوششیں کررہے ہوتے تھے، اسرائیل اپنی غیر قانونی آبادکاری جاری رکھتے ہوئے خاموشی کے ساتھ دوریاستی حل کا امکان ختم کر دیتا تھا۔ درحقیقت اس وقت فلسطینی اپنی ہی سرزمین پر نہایت تنگی سے رہنے پر مجبور ہیں، جہاں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتے کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھیں (اسرائیل کے مفاد میں) اوراپنی غربت ختم کرنے کا بندوبست کریں۔

اب اسرائیل ایک فلسطینی ریاست کے امکان پر آمادہ ہونے کی ہمت کرسکتا ہے، کیونکہ ''ایسی کوئی ریاست ہوگی ہی نہیں۔'' اس خیالی قبول کردہ ریاست سے عمداً انحراف کی وضاحت کولمبیا انسائیکلوپیڈیا میں لفظ 'اسرائیل' کے اندراج میں کچھ اس طرح ہے: ''اسرائیل کی آبادی جس میں غالب اکثریت یہودیوں کی ہے، نمایاں ترین اقلیت مسلمان ہیں''۔ پڑھنے والوں کو حیران ہونا چاہیے کہ یہ نمایاں اقلیت وہاں پہنچ کیسے گئی ہے!

دوسری اتنی ہی نمایاں بات اس سارے عمل میں یورپ کی غیر موجودگی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ عرب ممالک نے خود بھی اس کے لیے زیادہ تگ و دو نہیں کی ۔ بہتر ہوتا اگر وہ کرتے۔ یورپ کی اپنی کیفیت یہ ہے کہ حالیہ برسوں میں بش انتظامیہ کے دور میں یورپ اورامریکہ کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کے دوران بھی یورپ مشرقِ وسطیٰ میں اپنا آزادانہ کردار ادا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ انہوں نے اس مقولے کو سچ کردکھایا ہے کہ یورپ ایک اقتصادی دیو لیکن سیاسی بونا ہے۔

## مستقبل کی راہ

مشرقِ وسطیٰ میں آئندہ کیا ہوگا یہ کہنا بالکل غیر یقینی ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ شورش اور تشدد کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اسرائیل کے لیے امن کی نسبت مستقل جنگ اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے زیادہ آسان ہے۔ ایسی صورتِ حال میں یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ معاشی امداد سکڑتی چلی جائے۔

صورتِ حال کچھ بھی ہو، اسرائیل کا وجود اس وقت تک خطرات میں گھرا رہے گا جب تک وہ اس گمراہ کن رویہ پر مُصر ہے کہ نسل پرستی پر قائم ایک جعلی جمہوری ملک کے تحفظ کا انحصار فلسطینیوں کو ظالمانہ طریقوں



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے دبا کر رکھنے اور ان کے ساتھ تیسرے درجے کے شہریوں جیسا سلوک روا رکھنے میں ہے۔ حنان اشراوی نے درست کہا ہے کہ "اس سے پہلے کسی مفتوحہ فوج نے محبوس شہری آبادی کا دم گھونٹ دینے والا ایسا محاصرہ کبھی نہیں کیا ہو گا جس نے فلسطینیوں کو ایک تعذیب زدہ قوم بنا کر رکھ دیا ہے۔ ان کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ حریت، آزادی اور وقار کے ساتھ ایک غیر متزلزل عہد نبھا رہے ہیں۔"

ایک مثال ملاحظہ کیجیے: ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ ایک اسرائیلی عدالت نے ایک فلسطینی کو قتل کر دینے والے اسرائیلی فوجی کو 0.03 ڈالر یعنی 3 سنٹ جرمانے کی سزا سنائی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ فلسطینوں کو قتل کرنا، فوجی وغیر فوجی سرائیلیوں کے لیے کیوں آسان ہے۔

اس طرح سے معاملات چلانے والا ملک جس کی آدھی آبادی آزاد ہو اور آدھی غلام، طویل عرصہ قائم نہیں رہ سکتا۔ حقیقت یہی ہے کہ اگر اسرائیل نے یہ مکروہ سلسلہ جاری رکھا تو یہ بھی اسی خطے میں آٹھ سو سال پہلے قائم ہونے والی صلیبی ریاستوں کی طرح ختم ہو جائے گا۔

اہلِ یورپ ان واقعات کو ششدر ہو کے دیکھتے رہتے ہیں۔ جرمنوں کے لیے ان میں سچائی تلاش کرنا مشکل نہیں، کیونکہ وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ معصوم فلسطینی جن کا نازیوں کے جرائم سے کوئی لینا دینا نہیں تھا، ناکردہ جرم کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ہولوکاسٹ کے بعد انصاف پر مبنی فیصلہ یہ ہوتا کہ بچے کھچے یہودیوں کو فلسطین کی بجائے جرمنی کے مختلف حصوں میں آباد کر دیا جاتا۔

ذرا اس قابلِ فہم مگر انتہائی مضحکہ خیز بات کو دیکھیے: کہ جرمن حکومت نے آش وز اور دیگر مقامات پر جرمنوں کے جرائم کی تلافی کے لیے اسرائیل کو کئی بلین ڈالرز کی ادائیگی کی اور انہیں جدید ترین ہتھیار فراہم کیے۔ دوسرے الفاظ میں صیہونیوں کی مدد کی تاکہ جس طرح نازیوں نے یہودیوں پر مظالم ڈھائے تھے، اب یہودی بھی عربوں پر دباؤ برقرار رکھنے، انہیں اُن کے علاقوں سے بے دخل کرنے اور اذیتیں دینے میں پوری طاقت صرف کر سکیں۔

فیکٹریوں کے گیس چیمبرز میں جس طرح بڑی تعداد میں قتل عام کیا گیا اور نسلی صفایا کیا گیا، اس سے ہولوکاسٹ کی ہولناکی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا بہت بُرا فعل تھا۔ اس



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے باوجود بھی اہلِ یورپ کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ اسرائیل کس طرح اپنے باپ دادوں پر ہونے والے ظلم سے کئی گنا زیادہ ظلم فلسطینیوں پر ڈھا رہا ہے۔

نازیوں کو بھی اپنے نسلی امتیاز کے نظریے کے ساتھ فرار ہونا پڑا تھا۔ خانہ بدوشوں اور یہودیوں کے ساتھ نسلی امتیاز برتنے سے کیا ہوا؟ ان میں سے بہت بڑی تعداد میں لوگ مصیبت سے بچنے کے لیے بھیس بدل کر رہنے لگے۔ اور جو لوگ نازی حکومت کی مخالفت کرنے پر تیار ہوئے، ان کے لیے بھی بھیس بدل کر پھرنے والے گسٹاپو کے ایجنٹوں کی نظروں سے بچنا ممکن نہیں تھا۔

ہم بھی مشرقِ وسطیٰ کے پس منظر میں اسی طرح کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

(الف) جہاں تک مسئلہ فلسطین کے لیے ایک مؤثر اور بھرپور حمایت کی بات ہے تو عرب دنیا اس سلسلے میں بہت ہی تاریک تصویر پیش کر رہی ہے۔ جناب خالد رحمٰن نے اسے نہ صرف عربوں کے اتحاد و اتفاق میں کمی سے تعبیر کیا ہے بلکہ ان کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے کہ الفتح اور حماس کے درمیان موجودہ تنازعہ اس شک وشبہ کو طول دینے کی وجہ سے ہے کہ الفتح کسی سازش کا حصہ ہے۔ نتیجتاً اس کا سارا فائدہ اسرائیل اور امریکہ کو ہو رہا ہے۔

(ب) اس مسئلہ میں یورپ کی سوچ بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ عام لوگوں کی ہمدردیاں فلسطینیوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ بعض افراد تو یہاں تک محسوس کرتے ہیں کہ اسرائیلیوں کی سفاکی نے نازیوں کے جرائم کو بھی کم کر دیا ہے۔ ساتھ ہی حکومتوں کی خواہش بھی پوری ہو رہی ہوتی ہے کہ لوگ ٹی وی سکرینوں پر بہت کم صیہونی جرائم دیکھ پاتے ہیں جب تک کہ وہ قطر میں چلنے والے الجزیرہ ٹی وی کے عربی یا انگلش پروگرام نہ دیکھ لیں۔ غیر شعوری طور پر اہل یورپ ایک جرمن ضرب المثل کی اتباع کر رہے ہیں ''میں جس چیز کے بارے میں علم نہیں رکھتا وہ مجھے پریشان نہیں کرتی۔'' یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل یورپ کی فلسطینیوں سے ہمدردی آسانی سے عملی تعاون یا قربانی کی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔

(ترجمہ: سلمان طاہر)



© rasailojaraid.com